سرسیّد احمد خان کی علمی اور فکری جہات—ایک بازدید

ممتاز کلیانی☆
Mumtaz Kaliyani
سامیہ کومل☆☆
Samia Komal

Abstract:

Reviewing the nineteenth century colonial literature and literati characters, the post colonial critics have developed a linear narrative. This narrative propagates that Imperialists had initiated a particular type of discourse to establish a colonial structure of authority and sovereignty. For, the imperial powers used a selective class of personalities. Analysis of the contribution of Aligarh Movement and Sir Syed Ahmad Khan in this perspective can be a good attempt to understand the tyrannical tactics of the colonial imperialists. However, the question arises whether the comparison of nineteenth century social, political, cultural and economic structure with twenty first century globalized hierarchical values would be justified or not? Especially when an active flow of information without evaluation, would have make it difficult to access authentic facts. If nineteenth century be considered a continuity of classical age and role of Sir Syed be analyzed as one of the characters of Classical age, then how that classical man will collect information in the wake of imperial modernists' introduction of marvels of new science and technology? And how far he would be able to develop a traditional or postmodern narrative against the imperialists? This is a difficult question to answer? The paper evaluates the role of Sir Syed in a way that impact of his Intellectual and literary services on society and Muslim community be placed in perspective. For, other than the discourse of tyrannical imperialism and its offshoots, the level of sincerity, devotion, dedication and thorough concerns with the issues of communal identity as human value system, distinct from all other discourses, forms the crux of the debate in this paper.

☆ پروفیسر شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
☆☆ سکالر ایم فل، شعبۂ اُردو، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

انیسویں صدی کے ہندوستان میں نوآبادیاتی عہد کے ادب اور ادبی کرداروں کا جائزہ لیتے ہوئے ہمارے زمانے کے نقاد یک طرفہ بیانیہ جاری کرتے ہیں کہ نوآبادیاتی استعمار اپنی ہیئتِ حاکمہ استوار کرنے کے لیے مخصوص طرز کا ڈس کورس جاری کرنے کے لیے ادارے قائم کر رہے تھے اور منتخب شخصیات کو اپنا آلۂ کار بنا رہے تھے، علی گڑھ اور سرسید احمد خان کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی روش نوآبادیاتی استعمار کے استبدادی ہتھکنڈوں کو سمجھنے کی حد تک علمی کوشش قرار پا سکتی ہے، لیکن ڈیڑھ صدی قبل کے ہندوستان کی سماجی، سیاسی، معاشی و معاشرتی ہیئت کو موجودہ گلوبل عہد کی تذویراتی قدروں کے ساتھ ماپنا/ مقابلہ کرنا کیوں کر درست ہوگا؟ جب بظاہر مستعد معلومات کا انبوہ، جمِ غفیر کی صورت مستند معلومات تک رسائی کو مشکل سے مشکل تر بنا رہا ہو؟ انیسویں صدی کے ہندوستان کو کلاسیکی عہد کے مماثل قرار دے دیا جائے اور اس کلاسیکی عہد کے کرداروں میں سرسید احمد خان کو ایک کردار مان لیا جائے اور یہ طے ہو کہ جدیدیت کے علمبردار حکمران اپنے استعمار کو تقویت دینے کے لیے نت نئی معلومات کے انبوہ کے ساتھ ہندوستان کو حیرت کدہ بنائے ہوئے ہیں، ایسے میں کلاسیکل عہد کا انسان معلومات تک رسائی کیوں کر حاصل کر سکے گا؟ اور اگر حاصل کرے گا بھی تو کس حد تک استعمار کے خلاف روایتی یا مابعد جدید بیانیہ جاری کر پائے گا۔ یقیناً مشکل بات ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں سرسید احمد خان کے علمی و ادبی کردار کا اس طرح سے جائزہ لیا گیا ہے کہ ان کی بدولت معاشرے اور مسلمان قوم پر اس کے اثرات ابھر کر سامنے آسکیں۔ استعمار و استبداد کی بحث سے قطعِ نظر خلوصِ نیت اور قومی احساس کی بے پایاں شدت اور وابستگی کا پہلو دیگر تمام پہلوؤں سے جدا ہو کر ایک اہم انسانی قدر کے طور پر نئے بیانیے میں جگہ پا سکے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کے ہندوستان میں مسلمانوں کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے، سیاسی، علمی اور سماجی شعور کی تربیت کرنے میں سرسید احمد خان کا نمایاں کردار رہا ہے۔ معاشرے کا دھارا کسی اہم سمت میں رواں کرنے کے لیے کسی رُجحان یا رویے کو مرکزِ نگاہ بنانا پڑتا ہے۔ ہندوستانی معاشرہ ایک عرصے سے حوادث کی زد میں رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا زمانہ وہ پُرآشوب وقت تھا جس نے ہندوستان کی مادّی و روحانی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ہندوستان ایک کثیر الاقوام خطہ ہے اور مختلف اقوام کے مذاہب اور رسوم بھی مختلف ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد جس نفسا نفسی کا سامنا مسلمانوں کو (من حیث القوم) ہوا دوسری کسی قوم کو نہیں ہوا۔ اِس حوالے سے مظہر حسین سے منقول ہے:

> ''قبل ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اس کے بعد کے حالات اور خصوصی طور پر مسلمانوں کی طرف انگریزوں کی پالیسی کو ذہن میں رکھنا ناگزیر سا معلوم ہوتا ہے۔۔۔ مسلمان کا مطلب زیادہ تر انگریز افسران اور حکمرانوں کی نظر میں باغی تھا۔ انگریز یہ قیاس کرتے تھے کہ چوں کہ ہندوستان کے سابق حکمران مسلمان تھے اس لیے اُنھوں نے اپنی گزشتہ حکومت کو پھر سے حاصل کرنے کے لیے بغاوت کی رہنمائی کی تھی۔''(۱)

اِس ضمن میں مسلمانوں کا مذہبی حوالے سے سخت گیر ہونا مسلمانوں کے لیے مشکلات کا باعث بن رہا تھا۔ ہندوستان کے مسلمان کو مذہبی کٹر پسندی سے اجتناب کرنے کی ضرورت تھی۔ خود کو روشن خیال بنانے کی ضرورت تھی۔ دوسرے لفظوں میں عقل کی اساس یعنی سیکولرازم کو مضبوط بنانے کی ضرورت تھی۔ سیکولرازم کی ضرورت سب سے پہلے سرسید احمد خان نے محسوس کی۔ اس نظامِ فکر کی کلید عقل اور اس میں عقائد اور معجزات کی بجائے سائنسی حقائق پر انحصار مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ سرسید احمد خان ایک پڑھے لکھے گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔ اس وقت اگر وہ چپ چاپ ہجرت کر جاتے تو شاید کافر نہ کہلواتے، باغی نہ سمجھے جاتے، ان کو نیچری یا برطانوی وظیفہ خوار نہ کہا جاتا۔ سرسیّد احمد خان طبعاً بزدل آدمی نہ تھے اس لیے ان القابات نے ان کا اعتماد متزلزل نہ کیا بلکہ ان کی دلیری کو اور آب دی۔ اس صورتِ حال پر ان کا موقف بہت واضح ہے:

> ''غدر کے بعد مجھ کو نہ اپنا گھر لٹنے کا رَنج تھا، نہ مال واسباب کے تلف ہونے کا۔ جو کچھ رَنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا۔۔۔۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔''(۲)

یہی وہ دلیل تھی جو سرسیّد احمد خان کی نئی جدوجہد کی راہ متعین کرنے میں مددگار ٹھہری۔ سرسیّد احمد خان مسلمانوں کو ہر حال میں سویلائزیشن کے مقام پر فائز دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے اُنھوں نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر غور کرنا شروع کیا تو سب سے بڑی وجہ مسلمانوں میں بھیڑ چال یا اندھی تقلید کا رویہ نظر آیا۔ وہ مسلم سماج کو مہذب بنانے اور سماجی برائیوں سے چھٹکارا پانے کی ترغیبیں سوچنے لگے۔ اُنھوں نے اس وقت کی ترقی یافتہ اقوام (یونانی اور دیگر مغربی اقوام) کے حالات کا مشاہدہ کیا اور اس جوہر کی نشاندہی کی جس کے باعث وہ اقوامِ دنیا پر حکومت کرنے کے قابل ہوئی تھیں۔ اُنھوں نے دُنیا کی بہت سی اقوام کے مذاہب کا بھی مطالعہ کیا اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی تعلیمی پستی ہی اصل اور بڑی وجہ ہے، مذہبی کٹر پسندی کی جگہ اجتہادی اور استدلالی رویے کی ضرورت ہے۔ سرسیّد احمد خان زندگی بھر شاہ ولی اللہ کے اِس نظریہ پر عامل رہے کہ اجتہاد ہر دَور میں ضروری ہے۔ ان کے سماجی مؤقف کو مزید تقویت ''تہذیب الاخلاق'' کی تحریروں نے بخشی۔

> ''سرسیّد احمد خان 'تہذیب الاخلاق' میں مصلح قوم، مذہبی مفکر، معاشرتی اصلاح کے وکیل اور مصلح اُردو ادب نظر آتے ہیں۔ مصلح قوم کی حیثیت سے وہ اُن برائیوں کے خلاف سینہ سپر نظر آتے ہیں جو مسلمانوں کو من حیث القوم تباہ و برباد کر رہی تھیں۔۔۔۔ سرسیّد احمد خان سائنسی فکر کے حامی تھے اور اسے عقلیت پسندی کے عین مطابق خیال کرتے تھے۔''(۳)

۱۸۵۷ء کے بعد سرسیّد احمد خان نے مسلمانوں کی زبوں حالی دیکھتے ہوئے جن مسائل کی

نشاندہی کی تھی وہ سیاسی، تہذیبی اور علمی پستی سے متعلق تھے۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کا زوال دُور کرنے کے لیے نئی تعلیم اور سائنسی شعور کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بات بھی جانتے تھے کہ مغربی جارحیت کا مقابلہ بندوق کے بجائے تعلیم سے کرنے کی ضرورت ہے۔ اُن کی اس سوچ کی وجہ سے انہیں کافر، ملحد، دہریہ اور نیچری کہا گیا، ان کا جرم صرف اتنا تھا کہ وہ عقل پسند، منطق کے قائل، استدلالی رویّے کے حامی اور سائنس کے شیدائی تھے۔ اُن کے زمانے کی طرح آج کے معاشرے میں بھی یہ سب جرائم کی حیثیت سے دیکھے جاتے ہیں۔ علم و عمل سے عاری معاشرے اور عقل سے فائدہ نہ لینے والے منکروں کے متعلق ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے مضمون میں اشارہ کیا ہے:

> ''جس طرح گوہر جان کلکتہ والی کے پاس اللہ کا دِیا سب کچھ تھا مگر شوہر نہ تھا۔ اسی طرح مسلمانوں کے پاس بھی سب کچھ ہے مگر عقل نہیں۔ اسی لیے وہ عقل کے ثمرات، فلسفہ، منطق اور سائنس سے محروم رہے ہیں اور رہیں گے۔۔۔ انشاءاللہ۔''(۴)

سر سید احمد خان نے اپنی قوم کی سویلائزیشن اور ذہنی ترقی کا بیڑا اس وقت اُٹھایا جب زمین مسلمانوں پر تنگ تھی اور انگریز حکومت نے مسلمانوں پر آسائش اور کشادگی کے دروازے بند کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ سرسیّد احمد خان نے جو ''تہذیب'' کا پرچار کیا، یہ اصل میں کیا ہے؟ یہ تہذیب کن اُصولوں پر مبنی ہے؟ اس ضمن میں سرسید کے افکار ہم پر لفظ 'تہذیب' کے معنیٰ اور مفہوم واضح کرنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں:

> ''ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلہ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر ان کو متوجہ ہونا چاہیے:
> (۱) آزادیٔ رائے۔۔۔۔۔، ہنر و فن و حرفہ۔۔۔۔''(۵)

اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سرسید احمد خان نے حصولِ مقصد کے لیے دو مورچے قائم کیے: ایک تنظیمی اور دوسرا تعلیمی مورچہ۔ ان کی تنظیمی کاوشوں کا واضح ثبوت ایم اے او کالج تھا جو مسلم یونیورسٹی کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور تعلیمی کارنامہ میں رسالہ تہذیب الاخلاق، سب سے اہم ہے۔ 'تہذیب الاخلاق' ہی ان کے خاص افکار کا شارح ہے۔

سرسیّد احمد خان کے افکار سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ''دانائی مومن کی میراث ہے'' پر عامل تھے۔ ان کے نزدیک قوموں کی ترقی پرانے اور فرسودہ احکامات کی تقلید کرنے میں نہیں بلکہ ترقی یافتہ قوموں کے وضع کردہ قوانین پر عمل کرنے میں مضمر ہے اور اس میں بھی وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو ذہن میں رکھنے پر زور دیتے ہیں۔ سرسیّد احمد خان متنوع جہات کی حامل شخصیت تھے۔ سرسیّد کے نزدیک:

> ''قومیں بھی اسی طرح ہیں جیسے کہ کوئی شخص آپس کی معاونت سے عمدہ ترقی پاتے ہیں اس

طرح کہ جو اُن کے پاس ہے اوروں کو دیں اور جو ان کے پاس نہیں ہے وہ اوروں سے لیں۔ اسی اُصول پر دُنیا کے انتظام اور علم کی ترقی اور تربیت کے پھیلنے کی بنیاد ہے۔۔۔''(۶)

مقالاتِ سرسیّد سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ کھلے ذہن کے مالک تھے اور نئے افکار کا استقبال خوش دِلی سے کرتے تھے۔ اُنھوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ علم کبھی بھی جاگیر کی شکل اختیار نہیں کرتا بلکہ علمی حقائق نت نئی تحقیقات سے سامنے آتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر کئی اہداف تھے مگر سب کی اساس عقل پر تھی۔ سرسیّد احمد خان کا نظریۂ عقلیت اِسی بنیاد پر اُستوار ہے۔ اُنھوں نے عقیدہ اور عقل کو ایک دوسرے سے الگ قرار دیا۔ اُنھوں نے عقل کو عقیدہ کا پیش رَو قرار دینے میں انسان اور جانور میں خطِ امتیاز کھینچا کہ انسان تو کسی نہ کسی عقیدے کا قائل ہوتا ہے اور یہ عقیدہ وہ عقل کی بنیاد پر ہی پالتا ہے جبکہ جانور ایسا نہیں کر سکتے۔ اِس حوالے سے سرسیّد احمد خان کہتے ہیں:

''ان سب مباحثوں کے بعد میں نے یقین کیا کہ علم یا یقین یا ایمان حاصل کرنے کا وسیلہ صرف عقل ہے جو ان چیزوں کے حاصل کرنے کے لیے آلہ اور نہایت عمدہ رہنما ہے۔''(۷)

مسلمان آج بھی اسلام اور دیگر سماجی تقاضوں کی کشمکش میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ سرسیّد احمد خان نے عقلی اساس پر مبنی اُصول وضع کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُس وقت جب اُنھوں نے جدید ٹیکنالوجی کے فروغ کی بات کی تھی تو یہ اسلام سے انحراف یا مغربیت سے مطابقت نہیں بلکہ جدیدیت کی بنیاد رکھنے کی طرف مناسب قدم تھا۔ سرسیّد احمد خان کی سائنٹفک سوسائٹی کا قیام جدید علوم وفن کا راستہ ہموار کرنے کی ہی ایک سعی تھی۔ سرسیّد احمد خان کی راہ میں بے پناہ رکاوٹیں تھیں۔ سب سے بڑی رکاوٹ ان کے رفقاء تھے۔ وہ گومگو کی کیفیت میں تھے کہ وہ سرسیّد کا ساتھ دیں یا نہ دیں، لیکن یہ کشاکش سرسیّد احمد خان کی جدید سوچ اور عظیم فکر کے آگے ہیچ ثابت ہوئیں اور ان کا مؤقف وقت کے ساتھ ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔ ان کے رفقا ظاہر میں ان کے ساتھ نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی راہ پر عمل پیرا تھے۔ ڈاکٹر محمد آصف اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''سرسیّد نے مغربیت اور جدیدیت کے درمیان فرق اُجاگر کر کے مسلمانوں میں جدید ٹیکنالوجی اور مغربی سائنس کا شوق پیدا کیا۔ اُنھوں نے قرونِ وسطیٰ کی ذہنیت رکھنے والے علماء کو بھی یہ احساس دِلایا کہ وہ وقت کے تقاضوں کو سمجھیں۔''(۸)

سرسیّد کے ان اقدامات سے انگریزی تعلیم کے حوالے سے مسلمانوں کی نفرت میں کمی ہوئی اور مسلمانوں نے جدید علم وفن پر توجہ دینا شروع کی۔

سیاسی، سماجی اور مذہبی خدمات کے ساتھ ساتھ سرسیّد احمد خان نے ادبی نقطۂ نظر بھی واضح کیا۔ یہاں قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اُنھوں نے ترغیب تو جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علم اور انگریزی تہذیب و تمدن کی دی لیکن ذریعۂ اظہار اُردو زبان کو بنایا۔ وہ یہ بات جانتے تھے کہ قوم اگر اپنی زبان سے دُور ہو

جائے تو بھی اس کی تنزلی یقینی ہوتی ہے۔ اس لیے سرسیّد احمد خان نے جتنے بھی مضامین لکھے وہ اُردو زبان میں ہیں۔ ان کے یہ مضامین اخلاقی موضوعات و معیارات کے حامل ہیں۔ اُن کے نزدیک جو قومیں اخلاقیات کے معاملے میں فکر اندوزی نہیں کرتیں وہ کبھی بھی مشعل راہ کا درجہ حاصل نہیں کر پاتیں۔

سرسید احمد خان نے اردو میں خرد افروزی کی روایت کی بنیاد رکھی۔ دوسرے لفظوں میں انہوں نے بھیڑ چال یا اندھی تقلید جیسے رویوں کو شدید تنقیص کا نشانہ بنایا۔ وہ عقیدے اور فکر کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک عقل ہی وہ آلہ ہے جس میں تمام باتوں کی اصلیت کا علم ہوتا ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے مسلمانوں کو جدید سائنسی علوم حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ انہوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ ہمارے دنیاوی مسائل دعا، تعویز، نذر و نیاز، منتوں، چڑھاووں اور مزاروں کے چوکھٹ چومنے اور چلے کاٹنے سے حل نہیں ہو سکتے۔ مغربی قوموں کی ترقی کے راستوں پر گامزن ہونے سے حاصل ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے کائنات کی تخلیق، آدم و حوا کا قصہ، انبیاء کرام، وحی کی حقیقت، فرشتہ، جن اور شیطان، لوح و قلم، نوشتہ و تقدیر، روزِ جزا و سزا، حشر، معراج، کرامات اور معجزات، نماز، انسان اور خدا غرض ان تمام عقائد کی عقلی توضیحات پیش کیں۔ ان کی سوچ سیکولر تھی اسی لیے وہ دینی اُمور کو عقل کی بنیاد پر سمجھتے اور بتاتے تھے۔

ادب کے حوالے سے سرسیّد احمد خان کا کردار اس لیے اہم ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو تہذیب یافتہ بنانے کے لیے تعلیم کا نسخہ تجویز کیا۔ اپنے غور و فکر سے ادب برائے ادب کا نظریہ فرسودہ قرار دیا اور ادب برائے زندگی کی آمیزش کو قومی اور ملّی ترقی کی سند قرار دیا۔ انجمن پنجاب کے تحت ہونے والے مناظموں کو سرسیّد نے خوش آمدید اسی لیے کہا کہ یہ کلام نیچر کی طرف مائل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُردو شعری روایت کے گل و بلبل، عشق و عاشقی اور ہجر و وصال سے بھرپور غزل کے مضامین میں بھی وسعت دی۔ یہ وہی دَور تھا جب انگریزی ادب میں رومانویت کا آغاز ہو چکا تھا۔ سرسیّد احمد خان شعر و ادب کی طاقت اور اثر پذیری کی خاصیت سے واقف تھے، اِسی لیے وہ ادب کی ماہیئت پر لکھتے ہیں:

> ''علم و ادب و انشاء کی خوبی صرف لفظوں کو جمع کرنے اور ہم وزن اور قریبوں تلفظ کلموں کی تُک ملانے اور دُور اَز کار خیالات پیدا کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ فنِ شاعری جیسا ہمارے زمانے میں خراب اور ناقص ہے اس سے زیادہ کوئی چیز بُری نہ ہوگی۔ مضمون تو بہ جز عاشقانہ کے اور کچھ نہیں ہے۔ خیال بندی کا طریقہ اور تشبیہ اور استعارہ کا قاعدہ ایسا خراب اور ناقص کر دیا ہے جس سے طبیعت پر تو تعجب آتا ہے مگر اس کا مطلق اثر دِل پر، خصلت میں یا انسانی جذبات پر نہیں ہوتا۔ شاعروں کو یہ خیال ہی نہیں ہے فطری جذبات اور ان کی قدرتی تحریک اور ان کی جبلی حالت کا کس پیرایہ یا کنایہ یا اشارہ یا تشبیہ اور استعارہ میں بیان کرنا کیا کچھ دِل پر کیا اثر کرتا ہے۔''(۹)

سرسیّد احمد خان نے اولین طور پر اُردو ادب کو حقیقی زندگی کا ترجمان بنایا۔ معاشرے کو سوچنے کی طاقت بخشی اور مسلمانوں کو جدید سائنسی اور تعلیمی تصورات سے واقفیت دلائی۔ سرسیّد نے برصغیر کے مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جو اقدامات کیے ان کے اثرات بھی خاطر خواہ مرتب ہوئے۔ سرسیّد کے دَور تک اُردو ادیبوں کا دائرہ کار مذہب، تصوف، موضوعی تاریخ نگاری اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا، شاعری میں غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی اور شہر آشوب نمایاں تھے۔ سائنسی نقطۂ نظر پر مبنی کوئی تحریر منصۂ شہود پر نہیں تھی۔ اُردو نثر ابھی اپنے ارتقائی مراحل میں تھی۔ اس حوالے سے فورٹ ولیم کالج کی نثری خدمات قابلِ ذکر ہیں۔ غالب کی مکتوب نگاری اردو میں سلاست کی راہ دکھا رہی تھی مگر سرسیّد احمد خان کی مضمون نویسی نے موضوع کا جو تنوع اُردو نثر کی جھولی میں ڈالا وہ اہمیت سے خالی نہیں۔ سرسیّد احمد خان نے روشن خیالی کے علاوہ معاشرے میں علوم وفنون کی ترغیبات کے ساتھ ساتھ انسانی اخلاق کی اصلاح کے لیے مختلف النوع مضامین مثلاً 'بحث وتکرار'، 'تعصب'، 'اصلاحِ نسواں'، 'تعلیم وتربیت'، 'کاہلی'، 'قومی ہمدردی'، 'خودغرضی'، 'ریاکاری' اور 'خوشامد' ایسے مفصل مضامین لکھے۔ اس طرح ایک رائے یہ بھی قائم ہوتی ہے کہ برصغیر میں علمی، ادبی، تعلیمی اور سیاسی ترقی کا نیا دَور سرسیّد سے ہی شروع ہوتا ہے۔

> ''اُنھوں نے اُردو ادب کو نیا رُوپ، نیا آہنگ اور نیا عزم سفر بخشا۔ اردو نثر ایک مدت سے دور از کار تشبیہات، لایعنی استعارات اور شاعرانہ مبالغہ آرائی کے پیچ وخم میں گم تھی۔۔۔ سرسیّد کا یہ کارنامہ اُردو اَدب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا کہ اُنھوں نے اُردو زبان کو ایسی توانائی بخشی کہ وہ ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی اور فلسفیانہ غرض ہر قسم کے افکار اور مضامین کو صفائی، سادگی اور پُرتاثیر انداز میں ادا کرنے کے قابل بن گئی۔''(۱۰)

سرسیّد احمد خان کی وجہ سے جدید اصنافِ نثرِ اُردو میں مضمون نگاری، ناول نگاری، تبصرہ نگاری اور جدید تنقید سامنے آئیں۔ سرسیّد کی مضمون نگاری سے ایک بڑا حلقہ ان کا مخالف بھی ہوا لیکن وہ اُردو زبان کے سرمایۂ اصناف میں اضافے کے ارادے اور عمل میں ثابت قدم رہے۔ سرسیّد احمد خان نے کتاب اور صاحبِ کتاب کے نظریہ کو ایک ساتھ متعارف کروانے کے لیے تبصرہ نگاری کی طرح ڈالی۔ اِس تبصرہ نگاری سے جدید تنقید کے سوتے پھوٹے۔

نثر کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی سرسیّد کے نظریات کے اثرات نمایاں ہیں۔ خصوصاً حالیؔ کے ہاں جو نیچرل شاعری کی ترغیب ہے وہ سرسیّد کے نظریات کا پرتو ہے۔ دوسری طرف اقبال کے ہاں مشرق ومغرب کی تہذیبی کشمکش اور مشرقیت ومغربیت کے مابین مکالمہ کی صورت بھی سرسیّد کے اقدامات کی تکمیلی شکل ہے۔(۱۱)

شاعری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور شہر آشوب میں الفاظ کے چناؤ پر بہت توجہ دی جاتی تھی اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر مشکل الفاظ استعمال کیے جاتے تھے۔ اس کے برعکس سرسیّد کی قیادت میں نظم کو

پذیرائینفسِ مضمون کی سادگی، سلاست اور روانی کی وجہ سے ملی۔ اِس کی مثال حالی کی 'مسدسِ حالی' ہے۔ بقول ڈاکٹر سیّد عبداللہ:

> ''خالص شاعری کے متعلق بھی سرسیّد کا نقطہ نظر اجتماعی اور افادی ہے۔ سرسیّد نے شاعری کو تہذیب اور شائستگی کا لازمہ اور وسیلہ خیال کیا ہے۔ اُنھوں نے پرانی شاعری کے متعلق بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمارا فن شاعری بد جذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضدِ حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں۔''(۱۲)

اُردو شاعری میں مرصع و مسجع و مقفیٰ عبارت کی جگہ زبان کی صفائی اور سلاست نے لے لی۔ نثری اصناف میں سنجیدہ مضامین کو اہمیت ملی۔ بادشاہوں، امراء کی زندگیوں سے قطعِ نظر کر کے زندگی اپنے عام مسائل کے ساتھ لوگوں سے واقف ہوئی۔ اُردو کلاسیکی روایات کو جدید عصری تقاضوں اور روایات ورُجحانات میں بدلنے میں بھی سرسیّد کا نمایاں کردار ہے۔ ادب اور حیاتِ انسانی سرسیّد کی بے لوث اور انتھک مساعی کے نتیجے میں ہی باہم شیر وشکر ہوئی۔

غرض سرسید احمد خان اپنی تمام تحریروں اور اپنے قول وعمل میں صرف ایک بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو زمانے کے ساتھ چلنے، زمانے سے سبق سیکھنے اور بروقت خود کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ یوں سرسید احمد خان ایک بلند خیال مفکر، پُرخلوص ادیب، مصلح، جدت پسند شارحِ دین کے طور پر واضح شناخت رکھتے ہیں۔ وہ بنیاد پرستی کے سخت خلاف ہیں اور کلاسیکیت سے جدیدیت کی طرف سفر کرنے والوں کے پیش رَو ہیں۔ ان کے مضامین سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ قوم کے ظاہر و باطن میں تبدیلی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور یہ تبدیلی ان کے نزدیک خرد افروزی اور روشن خیالی کے بغیر نامکمل تھی۔ سرسید احمد خان نے سب سے پہلے خود روشن خیالی کا دعویٰ کیا اور اس کو اپنی ذات پر ثابت کیا۔ روشن خیالی اور خرد افروزی پر عمل پیرا ہو کر مغربی اقوام نے ترقی حاصل کی۔ سرسید احمد خان کے مطابق اس نظامِ فکر کو اپنائے بغیر مسلمان ترقی کی منازل طے نہیں کر سکتے۔

حوالہ جات

۱۔ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، نئی دہلی: ثمر آفسٹ پرنٹرز، ۲۰۰۲ء، ص ۲۱

۲۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، سرسید اور علی گڑھ تحریک، الٰہ آباد: تاج آفسٹ پریس، ۱۹۸۲ء، ص ۱۶

۳۔ محمد علی صدیقی، ڈاکٹر، سرسیّد احمد خان اور تہذیب الاخلاق، مشمولہ: تین ادبی وفکری تحریکیں۔ ایک محاکمہ، مرتبین: ڈاکٹر روبینہ ترین وغیرہ، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰

۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، سرسید تحریک کی فکری اساس، مشمولہ: (تین ادبی وفکری تحریکیں۔ ایک محاکمہ)، ص ۲۶

۵۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، سرسید اور علی گڑھ تحریک، ص ۱۰۵، ۱۰۶

۶۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۷۔ مظہر حسین، علی گڑھ تحریک سماجی اور سیاسی مطالعہ، ص ۹۸

۸۔ محمد آصف، ڈاکٹر، اسلام اور مغرب کے مابین مکالمے کی صورت (سرسیّد اور اقبال کے حوالے سے)، مشمولہ: (تین ادبی وفکری تحریکیں۔ ایک محاکمہ)، ص ۴۶

۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، سرسید تحریک کی فکری اساس، مشمولہ: (تین ادبی وفکری تحریکیں۔ ایک محاکمہ)، ص ۳۱

۱۰۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر، سرسید اور علی گڑھ تحریک، ص ۱۳

۱۱۔ محمد آصف، ڈاکٹر، اسلام اور مغرب کے مابین مکالمے کی صورت (سرسیّد اور اقبال کے حوالے سے)، مشمولہ: (تین ادبی وفکری تحریکیں۔ ایک محاکمہ)، ص ۴۸

۱۲۔ سیّد عبداللہ، ڈاکٹر، سرسیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۲۷۵